صدارتی نظام کی شرعی حیثیت

جناب محمد امین صاحب - ریاض، سعودی عرب

پاکستان میں حال ہی میں جو دستوری کوششیں ہوئی ہیں، ان میں انصاری کمیشن اور اسلامی نظریاتی کونسل دونوں نے ملک میں ایسے سیاسی نظام کی حمایت کی ہے جس میں زیادہ تر اختیارات سربراہ مملکت کے پاس ہوں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے علماء اور سکالرز کا عمومی رجحان یہ ہے کہ صدارتی طرز حکومت اسلامی مزاج کے زیادہ قریب ہے اور اس کی دلیل عام طور پر یہ دی جاتی ہے کہ یہ خلافتِ راشدہ کے نظام کے مماثل ہے، جس میں زیادہ تر اختیارات خلیفہ کی ذات میں مرتکز تھے۔ ہمیں چونکہ اس نقطۂ نظر سے اختلاف ہے اس لیے ہم اس رائے اور اس کے دلائل کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کے برعکس نقطۂ نظر کی حمایت میں شرعی دلیل لانے کی کوشش کریں گے کہ موجودہ حالات میں ایک ایسا نظامِ حکومت ہمارے لیے زیادہ موزوں اور مناسب ہے جس میں اختیارات ایک شخص کے بجائے متعدد اشخاص یا اداروں میں منقسم ہوں۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ طرز حکومت یا تقسیم اختیارات کا مسئلہ کوئی منصوص مسئلہ نہیں ہے۔ شریعت اسلامی کا عمومی منہج یہی ہے کہ جن امور کا ادراک عقل سے نہیں ہو سکتا یا جن میں کسی ردو بدل کا امکان نہیں ہے اور زیادہ زندگی کے بنیادی امور سے متعلق ہیں (عقائد، عبادات، حدود وغیرہ) تو ان میں شارع نے ہمیں واضح اور تفصیلی ہدایات دی ہیں تاکہ کسی شک و شبہ کا امکان باقی نہ رہے اور شریعت کی عمارت مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہو جائے،

اس کے بعد جہاں ایسے معاملات سامنے آتے ہیں جن میں تفصیلی اور فروعی احکام درکار ہوتے ہیں اور خصوصاً ایسے امور ہیں جو تمدن انسانی کے ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ بدل سکتے ہیں یا مختلف سوسائیٹیوں میں انسانی عادات اور رسوم و رواج کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں تو ایسے امور میں شریعتِ اسلامی کا منہج یہ ہے کہ وہ بنیادی قواعد و کلیات کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتی ہے اور تفاصیل سے تعرض نہیں کرتی بلکہ یہ امت کے اہلِ علم اور اہلِ حل و عقد پر چھوڑ دیتی ہے کہ وہ بنیادی اصولوں کی روشنی میں حسبِ ضرورت تفصیلات طے کرتے رہیں۔ نظامِ حکومت کا تعین اور اس میں تقسیم اختیارات کے مختلف اصول طے کرنا بھی اسی قبیل میں سے ہے کہ شارع نے سیاسی ڈھانچے سے متعلق بنیادی باتیں بتا کر تفصیلات سے تعرض نہیں کیا اور اسے امت پر چھوڑ دیا[1]، چنانچہ قرآن حکیم میں لفظ "ملک" کے بعض لوگوں کی طرف انتساب سے ملوکیت کی حمایت نہیں کی جاسکتی اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں مرتکز ہر طرح کے دینی اور دنیوی اختیارات سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کا نظامِ حکومت ایسا ہونا چاہیے جس میں سارے اختیارات آپؐ کی طرح ایک شخص کے ہاتھ میں ہوں کیونکہ حضورؐ کا یہ تعامل بربنائے نبوت تھا اور نبوت آپؐ پر ختم ہوگئی[2]۔ لہٰذا اس معاملے میں شرعی نقطۂ نظر سے دلائل کا انحصار نصوص پر نہیں اجتہاد پر ہے چنانچہ ہم پہلے تعامل صحابہ کی کیفیت اور شرعی حیثیت پر

---

[1] ڈاکٹر عبدالحلیم محمود سابق شیخ الازہر فی مقدمہ "ازمۃ الفکر السیاسی الاسلامی فی العصر الحدیث" ص ۶ ۔ شیخ عبدالمتعال الصعیدی فی "السیاسۃ الاسلامیۃ فی عہد الخلفاء الراشدین" ص ۵ طبع ۱۹۶۲ ۔ ڈاکٹر ثروت بدوی فی "اصول الفکر السیاسی والنظریات والمذاہب السیاسیۃ الکبریٰ" ص ۱۱۵ طبع ۱۹۶۰۔

[2] بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے بعد کسی کو نامزد نہ کرنا اور قیادت کا فوری انتظام کیے بغیر اس دنیا سے تشریف لے جانا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ نے عمداً اس کام کو مسلمانوں اور ان کے اہلِ حل و عقد پر چھوڑا ہے۔

گفتگو کریں گے اور پھر مصالح مرسلہ، سدّ الذرائع اور مقاصد الشریعہ جیسے فقہی قواعد کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہمارے لیے صدارتی طرزِ حکومت کیوں غیر موزوں ہے۔

تعامل صحابہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں سارے اختیارات خلیفہ کی ذات میں جمع تھے اور چونکہ عام صحابہ اور سارے خلفائے راشدین کا یہ تعامل بلا نزاع تھا اس لیے یہ اجماع اور ہمارے لیے حجت ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں دعوے محل نظر ہیں۔ اوّل تو یہ بات مبالغہ سے خالی نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں سارے اختیارات خلیفہ کی ذات میں جمع ہوتے تھے۔ ہر حکومت میں تین شعبے ہوتے ہیں: عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ۔ اس میں جہاں تک عدلیہ کا تعلق ہے تو اس میں شک نہیں کہ شروع شروع میں انتظامی اور عدالتی عہدے یک جا تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے آخری زمانے میں کام کے بار کی وجہ سے، علیحدہ قاضی مقرر کرنے شروع کر دیے تھے[1] اور بعد کی اسلامی تاریخ میں بھی قاضی کا عہدہ علیحدہ اور مستقل رہا۔ اسی طرح یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ انتظامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے خلیفہ قاضیوں کا تقرر کیا کرتا تھا لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ تقرر کے علاوہ خلیفہ یا انتظامیہ کا عدالت پر کوئی اثر نہ تھا۔ قاضی آزادی کے ساتھ خلیفہ اور اس کی حکومتی پالیسیوں کے خلاف فیصلے کرتے تھے اور عدالتی کارروائی کی اساس اللہ تعالیٰ کی شریعت تھی، خلیفہ یا حکومت کا کوئی الگ دستور یا قانون نہ تھا۔ اگرچہ خلیفہ کو مجتہد ہونے اور انتظامیہ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے عدالتِ مرافعہ کی حیثیت حاصل تھی، لیکن اس کے باوجود نہیں کہا جا سکتا کہ عدالتی نظام انتظامیہ کا ایک حصہ تھا یا خلیفہ کو عدالتی معاملات میں ہر بات پر دسترس[2] حاصل تھی۔

۱۔ ڈاکٹر عبدالمنعم البہی، تاریخ القضاء فی الاسلام، ص ۱۰۸، مطبعہ لجنۃ البیان العربی سنہ ۱۹۶۰ء

۲۔ ڈاکٹر شوکت علیان، السلطۃ القضائیۃ۔ ص ۲۶، دار الرشید، الریاض۔

اسی طرح جہاں تک ان معاملات کا تعلق ہے جو ایک اسلامی مملکت میں "مقننہ" سے متعلق ہیں یعنی تفصیلی قواعد و ضوابط تشکیل دینے کا کام، احکام منصوصہ کی تنفیذ کے لیے اور اور ایسے اُمور میں فیصلے کرنے کے لیے جن میں شریعتِ حقہ نے منصوص احکام نہیں دیئے ہیں (جسے آج کل "قانون سازی" سے تعبیر کیا جاتا ہے جو مغالطے سے خالی نہیں اور جسے شرعی اصطلاح کے مطابق اجتہاد کہا جانا چاہیے) تو خلافتِ راشدہ کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کام خلیفہ اکیلا اپنی مرضی سے یا محض حکومتی افسران کی مرضی اور مشورے سے انجام نہیں دیتا تھا بلکہ یہ کام اصحاب شوریٰ کے مشورے سے کرتا تھا اور شوریٰ میں قبیلوں کے شیوخ، سردارانِ قوم اور اہلِ علم صحابہ (مجتہدین) شامل تھے۔ جن اُمور کا تعلق مصالح عامہ سے ہوتا۔ اس میں مشورہ کا دائرہ کار بھی وسیع ہوتا اور جہاں مسئلہ علمی اور فقہی نوعیت کا ہوتا۔ وہاں انحصار فقہاء صحابہ کی رائے پر ہوتا۔ ان معاملات کے لیے خلافتِ راشدہ کے زمانے کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، خاص طور پر حضرت عمرؓ کے زمانے کی (طاعون عمواس اور ارض سواد کا قضیہ وغیرہ) لیکن ان واقعات سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ خلفائے راشدین ان معاملات میں اپنی مرضی چلایا کرتے تھے یا من مانی کیا کرتے تھے۔ بلکہ ان واقعات سے یہی مستنبط ہوتا ہے کہ وہ اہلِ شوریٰ کی رائے کا احترام کیا کرتے تھے اور اس کے خلاف نہ جاتے تھے[1]

آیاتِ شوریٰ کی تفسیر میں مفسرین کی ایک بڑی جماعت نے شوریٰ کے فیصلوں کو امام کے

---

[1] ڈاکٹر عبد الحمید اسماعیل، الشوریٰ و اثرہا فی الدیموقراطیہ، ص ۱۳۴، المطبعة السلفیہ، القاہرہ۔
— ڈاکٹر محمد سلیم العوا، فی النظام السیاسی للدولہ الاسلامیہ، ص ۱۹۸، المکتب المصری الحدیث، القاہرہ ۱۹۷۹۔
— ابوبکر الجزائری، الدستور الاسلامی، ص ۸، طبع المکتب الاسلامی۔
— ڈاکٹر عبد الکریم زیدان، مجموعہ بحوث فقہیہ، ص ۱۰۴، مکتبہ القدس ۱۹۷۶ء

لیے لازمی قرار دیا ہے[1] اور امام قرطبی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جو امام اور سلطان شوریٰ کے فیصلوں کو نہ مانے اُس کا عزل واجب ہے[2]۔ اور اگرچہ اس بات کا فیصلہ خلیفہ ہی کرتا تھا کہ مشورہ کس سے کیا جائے اور کب اور کس معاملے میں کیا جائے لیکن اس کے باوجود مذکورہ بالا تجزیے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ "مقننہ" کے معاملات میں خلیفہ بالکل خود مختار نہ تھا۔ (اور قانون شریعت کی بالادستی تو حاکم اور محکوم سب کے لیے موجود ہی تھی) اور جب عدلیہ اور "مقننہ" دونوں میں خلیفہ کا کردار محدود تھا تو اس کا مطلب واضح ہے کہ اس کی اصل حیثیت انتظامیہ کے سربراہ کی تھی جسے بعض عدالتی اور پارلیمانی اختیارات حاصل تھے (جیسا کہ آج کل کی حکومتوں میں ہوتا ہے) لیکن وہ بہرحال ہر معاملے میں مختار کل نہ تھا۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر یہ مفروضہ مان بھی لیا جائے کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں سارے اختیارات ایک خلیفہ کی ذات میں مرتکز تھے تو بھی یہ دلیل صحیح نہیں ہے کہ تقسیم اختیارات کا جو نظام خلافتِ راشدہ کے وقت رائج تھا اُسے من وعن اختیار کرنا ہمارے لیے ضروری اور محبت صحابہ کا عین تقاضا ہے کیونکہ صحابہ کرام کے قول و فعل کی قانونی لحاظ سے تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ صورت جس میں اُن کا قول و فعل بعد میں آنے والے مجتہدین کے لیے لازمی طور پر قابلِ اتباع ہے، دوسری وہ صورت جس میں صحابہ کرامؓ کے لازمی اتباع پر ائمہ اور سلف میں اختلاف ہے اور تیسری وہ صورت جس میں صحابہ کرامؓ کے اجتہادی طرز عمل کا اتباع بعد میں آنے والے مجتہدین کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ اُن کے لیے جائز ہے کہ وہ ان اُمور میں نئے سرے سے اجتہاد کریں اب ہم ان تینوں صورتوں پر مختصر گفتگو کریں گے۔

---

[1] جامع القرآن عن تاویل آی القرآن، طبری، جلد ۷، ص ۳۴۴ طبع دارالمعارف، مصر۔
— التفسیر الکبیر، رازی، جلد ۹، ص ۶۶، المطبعہ البہیہ المصریہ، القاہرہ ۱۳۵۷ھ

[2] الجامع لاحکام القرآن، قرطبی، جلد ۷ ص ۲۴۹، طبع دار الکاتب العربی ۱۹۶۱ م

آؤلاً: صحابہ کرام کا قول و فعل دو صورتوں میں حجت اور لازمی طور پر قابلِ اتباع ہے ایک تو اس صورت میں کہ وہ کوئی بات اپنی عقل و رائے سے نہ کہیں اس صورت میں اسے سنّتِ نبوی سمجھا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ مستقل نوعیت[1] کے کسی شرعی معاملے میں صحابہ کرام کا واضح اجماع ہو جائے[2]۔ اب آیئے خلفاء راشدین کے زمانے کے واقعات کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ طرزِ حکومت اور تقسیم اختیارات کے مسئلے میں کیا وہ متفق الرائے تھے اور کیا ان معاملات میں کوئی اجماع واقع ہوا ہے؟

۱۔ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب ایک بڑے پبلک اجتماع میں لمبی بحث و تمحیص کے بعد صحابہ کرامؓ نے کیا[3]۔ لیکن انہوں نے انتقالِ اقتدار اور نئے خلیفہ کے تقرر کے لیے اس طریقے کو پسند نہیں فرمایا جس سے وہ خود منتخب ہوئے تھے۔ بلکہ انہوں نے کبار صحابہ سے مشورے کے بعد حضرت عمرؓ کو نامزد فرمایا اور تمام لوگوں سے اس امر کی رضامندی حاصل کی۔ حضرت عمرؓ نے شہادت کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے طریقے پر عمل نہیں فرمایا، بلکہ چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلافت سنبھالنے کو کہا تو انہوں نے کہا کہ یہ تمہارا نہیں اہل بدر اور دوسرے کبار صحابہ کا کام ہے۔

۲۔ حضرت عمرؓ جب خلیفہ بنے تو آپ نے وظائف کی تقسیم اور مؤلفۃ القلوب کے سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ کی پالیسی ختم کر کے نئی پالیسی وضع کی۔ حضرت عمرؓ ہی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک قضیہ طلب صحابی نے آپ سے رجوع کیا۔ آپ نے اُسے قاضی کے پاس بھجوا دیا

---

[1] کیونکہ اجماع کے بارے میں بھی عمومی قاعدہ یہی ہے کہ اگر وہ وقتی مصالح یا اعراف پر مبنی ہو تو حالات اور عرف کے بدل جانے کے بعد نیا اجماع پہلے اجماع کی جگہ لے گا۔ ملاحظہ ہو: اسلام عقیدہ و شریعہ للشیخ محمود شلتوت، سابق شیخ الازہر، صفحہ ۷۵ طبع دار الشروق ۱۳۹۷ھ

[2] کیونکہ اجماع سکوتی کے حجت ہونے کے بارے میں ائمہ میں اختلاف ہے۔

[3] جس سے بعض صحابہؓ نے کھلم کھلا اختلاف کیا۔

جس نے فیصلہ کر دیا، کچھ دنوں بعد آپ کی اس شخص سے ملاقات ہو گئی تو پوچھا کہ تمہارے قضیے کا کیا بنا؟ اس نے کہا قاضی نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میں ہوتا تو اس کی جگہ یہ فیصلہ کرتا۔ اس شخص نے کہا کہ آپ کی رائے کے نافذ ہونے میں کیا مانع ہے؟ (کہ آپ تو امیر المومنین ہیں) آپ نے فرمایا نہیں، قاضی کی بھی رائے ہے اور میری بھی رائے ہے، جب حکم منصوص نہیں ہے تو پھر میری اور اس کی رائے میں کیا امتیاز ہے؟

۳۔ حضرت عمرؓ اپنے اعزہ کو سرکاری مناصب دینے سے اجتناب کرتے تھے، اس کے برعکس حضرت عثمانؓ نے اس پالیسی کی مخالفت کرتے ہوئے سرکاری مناصب فیاضی سے امویوں کو دیئے، گورنروں کی تقرری کا جو معیار حضرت عمرؓ نے مقرر کر رکھا تھا حضرت عثمانؓ نے اس کی بھی پیروی نہیں کی۔

۴۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد جب خلافت کمیٹی کے اجلاس شروع ہوئے اور باقی لوگوں کے کنارہ کش ہونے کے بعد میدان میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے (جو ثالث تھے) دونوں امیدوارانِ خلافت سے عہد لینا چاہا تو وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی پالیسیوں پر عمل کریں۔ حضرت عثمان نے عہد لے لیا لیکن حضرت علیؓ نے انکار کر دیا[1]۔

۵۔ ارض سواد کے قضیے میں صرف حضرت بلالؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور دوسرے کئی جلیل القدر صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے کو صحیح تسلیم نہیں کیا، خود حضرت عمرؓ نے مولفۃ القلوب کے سلسلے میں وہ "صک" پھاڑ دیئے جو حضرت ابوبکرؓ نے جاری کیے تھے۔ حضرت عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ نے قتلِ عثمانؓ کے بارے میں حضرت علیؓ کے موقف کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ان سے جنگ کی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے

---

[1] خدانخواستہ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حضرت علیؓ کو شیخین کا راستہ پسند نہ تھا بلکہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ خود صاحب الرائے اور مجتہد ہیں۔ اپنی حکومتی پالیسیاں خود بنائیں گے اور ضروری نہیں ہے کہ شیخین ہی کی وضع کردہ پالیسیوں پر عمل کریں۔

اسی معاملے میں حضرت علیؓ کے موقف کو رد کر دیا اور خونریز لڑائیاں ہوئیں - خوارج حضرت علیؓ کو گالیاں دیتے اور قتل کی دھمکیاں دیتے تھے - لیکن آپ نے کبھی ان کے خلاف کارروائی نہیں کی جب تک کہ انھوں نے جنگ میں پہل نہیں کی۔ مسجد نبوی میں منبرِ رسولؐ پر بیٹھے ہوتے حضرت عمرؓ نے جب کہا کہ سنو اور اطاعت کرو تو ایک صحابی نے اٹھ کر کہا کہ ہم اس وقت تک تمہاری اطاعت نہیں کریں گے جب تک تم یہ نہ بتاؤ کہ یہ قمیص جو تم نے پہن رکھی ہے اس کا کپڑا تم نے بیت المال سے بغیر استحقاق کے تو نہیں لے لیا۔ اسی طرح ایک مجلس میں ایک عام صحابی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اگر تم ٹیڑھے ہوئے تو ہم اپنی تلواروں سے تم کو سیدھا کر دیں گے۔

ان واقعات سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:-

— انتقال اقتدار اور نئے حکمران کے انتخاب و تعین کے بارے میں، نیز مالی، سیاسی اور انتظامی پالیسیوں کے بارے میں اور حکومتی طرزِ عمل کے بارے میں ہر خلیفہ راشد کی اپنی ایک رائے تھی جو دوسرے مختلف تھی۔

— خلفاء راشدین نے کبھی اپنے آپ کو مختار کُل نہیں سمجھا اور نہ صحابہ کرامؓ نے کبھی ان کو مطلق العنان گردانا، وہ کھلم کھلا ان پر تنقید کرتے اور ان کی پالیسیوں کی مخالفت کرتے تھے۔

— طرزِ حکومت اور تقسیم اختیارات کے سلسلے میں صحابہ کرام کا یا خلفاء راشدین کا کوئی اجماع واقع نہیں ہوا، بلکہ ان سب کے طرزِ عمل سے جو بات مستنبط ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان امور میں اختلاف جائز ہے اور انھوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے۔

— طرزِ حکومت اور تقسیم اختیارات کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ کا نہ واضح اجماع ہوا ہے اور نہ سکوتی - رہا مجرد تصرف اور فعل تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال بھی، سارے اصولیوں کے نزدیک، شرعی نقطۂ نظر سے وجوب پر نہیں بلکہ اباحت پر دلالت کرتے ہیں چہ جائیکہ صحابہ کرامؓ کے افعال کو واجب گردانا جائے۔

ثانیاً۔ وہ شرعی اُمور جن میں صحابہ کرامؓ کے فیصلے انفرادی اجتہاد پر مبنی ہوں اور جن میں ان کا اجماع نہ ہوا ہو بلکہ آپس میں اختلاف ہو اُن کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی یہ رائے ہے کہ کسی ایک صحابی کی رائے اختیار کر لی جائے اور مجموعی آراء کو رد نہ کیا جائے[1] اگرچہ احناف میں سے امام بزدوی اور کرخی نے، فروع میں امام کی تطبیقات سے امام کا یہ موقف مستنبط کیا ہے کہ صحابیؓ کی رائے سے مختلف رائے قائم کی جا سکتی ہے[2]۔ جب کہ امام شافعیؒ اور امام احمد کی ایک روایت یہ ہے کہ بعد کے اہلِ علم کے لیے صحابہ کرام کی اجتہادی آرا حجت نہیں ہیں[3]۔ اصولیوں میں سے امام غزالی اور آمدی نے اسی نقطۂ کی شد و مد سے حمایت کی ہے اور مخالفین کے اعتراضات کا ایک ایک کر کے جواب دیا ہے[4]۔

ثالثاً۔ ایسے امور جن میں صحابہ کرام کا اجتہاد یا اُن کی کوئی پالیسی وقتی مصلحتوں پر مبنی ہو یا اُس زمانے کی مخصوص ضروریات اور عرف کے مطابق ہو، ان اُمور میں تغیر کے بعد صحابہ کرام کے اجتہادات کی پیروی لازمی نہیں، بلکہ نئے حالات اور ضروریات کے مطابق نئے سرے سے اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ انتظامی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی اُمور کے بارے میں خلفاء راشدین کے فیصلے اسی قبیل میں سے ہیں[5]۔

---

۱ تاریخ بغداد للخطیب بغدادی ج ۱۳ ص ۳۶۸، مکتب الخانجی، ۱۳۴۹ھ۔

۲ کشف الاسرار ج ۳ ص ۹۲۷، دار الکتاب العربی ۱۳۹۴ھ۔

۳ الرسالہ للشافعی ص ۵۹۷ تحقیق احمد شاکر۔ دار التراث القاہرہ۔

۴ الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی ج ۴ ص ۲۰۱ دار الکتب العلمیہ بیروت۔

— المستصفیٰ للغزالی ج ۱ ص ۲۶۰ طبع دار صادر۔

۵ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

— الاحکام فی تمییز الفتاوی عن الاحکام ص ۲۳۱، ۲۴۹، مکتب المطبوعات الاسلامیہ ۱۹۶۷ء

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اس وضاحت سے صاف ظاہر ہے کہ طرزِ حکومت اور تقسیمِ اختیارات کا مسئلہ نہ تو منصوص ہے اور نہ صحابہ کرام کا کسی خاص طرزِ حکومت پر یا تقسیم اختیارات کی کسی شکل پر اجماع واقع ہوا ہے کہ اس کی پیروی ہم پر واجب ہو بلکہ یہ مسئلہ تو تیسری صورت سے تعلق رکھتا ہے کہ ہر خلیفہ راشد نے مقامی ضرورتوں اور حالات کے مطابق ان امور پر فیصلہ کیا ہے اور ہمارے لیے ان کا اتباع یہی ہے کہ ہم بھی اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق ان امور میں فیصلے کریں۔ (باقی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

— اعلام الموقعین لامام ابن قیم جلد ۳ صفحہ ۳ و جلد ۴ صفحہ ۲۲۸ طبع دار الجیل ۱۹۷۳ء

— الفروق للقرافی جلد ۱ ص صفحہ ۴۴، طبع دار المعرفہ بیروت ۱۳۴۲ھ

— ڈاکٹر عبداللہ ترکی، اصول مذہب الامام احمد صفحہ ۶۶۸، جامعہ عین شمس ۱۹۷۴ء

— ڈاکٹر محمد سلام مدکور، مناہج الاجتہاد ص ۳۸۱، جامعہ کویت

— ڈاکٹر محمد سلیم العوا، فی النظام السیاسی للدولۃ الاسلامیہ، ص ۲۴۰